فیض کا شعری لہجہ

اشرف لون

شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی، حضرت بل، سرینگر، موبائل:09797061700

فیض احمد فیض نہ صرف اردو کے بلکہ دنیائے ادب کے ایک بڑے شاعر ہیں۔ اگرچہ فیض ایک ترقی پسند شاعر ہیں اور وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے، لیکن جہاں تک فیض کی مقبولیت کا تعلق ہے تو یہ کہنا بیجا نہیں کہ فیض کو آج اُن کے حریف یا ''غیر ترقی پسند'' بھی ایک بڑا شاعر تسلیم کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔ فیض کی شاعری یا اس کے ڈکشن پر متعدد نقادوں نے اعتراض کیے، لیکن بالآخر ان نقاد صاحبان کو بھی فیض کی عظمت کے سامنے اپنا سر خم کرنا ہی پڑا۔ فیض کی اس مقبولیت میں جہاں اُن کے مخصوص احتجاجی لب و لہجے کا دخل ہے وہیں اُن کی جمالیاتی شعور اور فن پر مضبوط گرفت نے بھی اُن کی شاعری کو وہ مقبولیت عطا کی جہاں سے وہ آفاقیت کی سرحدوں میں داخل ہوئی۔ فیض فن کی جمالیاتی اقدار سے پوری طرح واقف تھے اور جانتے تھے کہ شاعری صرف نعرے بازی یا خطاب کا نام نہیں بلکہ جب تک شاعری میں شعری لوازم نہ پائے جائیں تب تک شاعری کی وقعت کچھ بھی نہیں اور اس کی حیثیت نعرے بازی سے کچھ زیادہ نہیں۔ وہ ایک پختہ اور بالیدہ فنی شعور رکھتے تھے اور ادب و فن میں جمالیاتی اقدار کی اہمیت کے بہت بڑے حامی تھے۔ اس سلسلے میں اُن کا خود کہنا ہے:

> ''حسن کی تخلیق صرف جمالیاتی فعل ہی نہیں افادی فعل بھی ہے، چنانچہ ہر وہ چیز جس سے ہماری زندگی میں حسن یا لطافت اور رنگینی پیدا ہو جس کا حسن ہماری انسانیت میں اضافہ کرے، جس سے تزکیۂ نفس ہو، جو ہماری روح کو مترنم کرے، جس کی لو سے ہمارے دماغ کو روشنی اور جلا حاصل ہو صرف حسین ہی نہیں مفید بھی ہے۔ اسی وجہ سے منجملہ غنائیہ ادب (بلکہ تمام اچھا آرٹ) ہمارے لیے قابل قدر ہے۔ یہ افادیت محض ایسی تحریروں کا اجارہ نہیں جن میں کسی دور کے خالص سیاسی یا اقتصادی مسائل کا براہِ راست تجزیہ کیا گیا ہو، اس سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر کسی شاعر کا کلام جمالیاتی تاثر کے اعتبار سے ناقص ہے تو یہ اس کی افادیت پر بھی اثر انداز ہوگا، ایسا کلام نہ صرف فنی یا جمالیاتی اعتبار سے حقیر ہوگا بلکہ اس کی افادیت بھی مشکوک ہوگی اور اس کے یہ بھی معنیٰ ہیں کہ محض مزدور، کسان، امن یا ایسا ہی کوئی دوسرا عنوان یا موضوع دوسری خوبیوں کی غیر موجودگی میں کسی تحریر کی ترقی پسندی کا واحد ضامن نہیں ہوسکتا۔''[1]

فیض کی شعری عظمت کا سب سے پہلا اور بڑا پہلو یہ ہے کہ چاہے اُن کی عشقیہ یا رومانی شاعری ہو یا انقلابی شاعری، ہر طرح کی شاعری میں انھوں نے فن کے جمالیاتی اوصاف کا بھرپور خیال رکھا۔ ایسا کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے جہاں ان کی فن پر گرفت ڈھیلی نظر آئے اور جہاں تک انقلابی شاعری کا تعلق ہے تو ایسے میں فنی اور جمالیاتی اقدار کا پاس و لحاظ رکھنا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے، لیکن فیض اس منزل سے بھی کامیابی کے ساتھ گزر گئے۔ ہاں کئی مقامات پر فن پر گرفت ڈھیلی نظر آتی ہے، لیکن یہ اتنا بھی نہیں کہ اس سے فیض کے شاعرانہ مرتبے پر کوئی حرف آسکے۔ فیض کی اسی شاعرانہ عظمت کے بارے میں پروفیسر انور پاشا رقمطراز ہیں:

> ''فیض کی شاعری کے متعلق اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی شاعری رومان اور حقیقت کا بہترین سنگم ہے۔ یہ درست بھی ہے کیوں کہ فیض کی شاعری میں یہ دونوں عناصر اس طرح باہم شیر وشکر دکھائی دیتے ہیں کہ اکثر اوقات رومان حقیقت اور حقیقت رومان کے پیکر میں ڈھلتی نظر آتی ہے۔ چونکہ فیض نے کوئے یار سے سوئے دار کی منزلیں طے کی تھیں۔ اس لیے ان کی شاعری میں جذبے کی صداقت اور خون جگر کی نمود ہر دو سطح پر دکھائی دیتی ہے۔ ان کا انقلابی آہنگ بھی شیرینی اور حلاوت کی چاشنی میں کھلا ہوا محسوس ہوتا ہے جو قاری کے جمالیاتی وجدان کو برانگیختہ کرنے کے ساتھ ساتھ اسے زندگی کی تلخ اور زہرناک حقیقتوں سے آشنا بھی کراتا ہے، لیکن اس طرح کہ طبیعت گرانی محسوس

کرنے کے بجائے بصیرت افروز کیفیت سے ہمکنار ہوجاتی ہے۔''[۲]

اس سلسلے میں فیض کے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جمے گی کیسے بساطِ یاراں کہ شیشہ و جام بجھ گئے ہیں
سجے گی کیسے شبِ نگاراں کہ دل سرِ شام بجھ گئے ہیں
بہت سنبھالا وفا کا پیماں، مگر وہ برسی ہے اب کے برکھا
ہر ایک اقرار مٹ گیا ہے، تمام پیغام بجھ گئے ہیں
مرے نالوں سے اکثر پوچھتی ہے ان کی معصومی
کوئی کیوں رات کی خاموشی میں اٹھ کے روتا ہے
اُن کا آنچل ہے کہ رخسار کہ پیرہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوجاتی ہے چلمن رنگیں

فیض کی ابتدائی شاعری کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ فیض کے یہاں عشقیہ موضوعات بھی بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ فیض نے عشق کے روایتی موضوع کو ایک نیا سانچہ اور لب و لہجہ عطا کیا، لیکن جلد ہی وہ عشق و حسن کے اس کوچے سے باہر نکل آئے اور ایک انقلابی شاعر کے طور پر اپنی شناخت قائم کی۔ جیسا کہ مشہور ہے کہ فیض نے پرانے الفاظ کو نئے تناظر میں استعمال کیا۔ یہ کچھ ایسی غلط بات بھی نہیں کہ بڑا شاعر جہاں اپنے ساتھ نئے الفاظ اور ایک نیا اسلوب لاتا ہے وہیں ایک بڑے شاعر کا کمال یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ پرانے الفاظ، تشبیہات، استعارات کو نئے مفاہیم بھی عطا کرتا ہے اور یہی چیزیں بعد میں اُس کی شناخت کا حصہ بن جاتی ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ
میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات

(مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ)

شام کے پیچ و خم ستاروں سے
زینہ زینہ اتر رہی ہے رات
یوں صبا پاس سے گزرتی ہے
جیسے کسی نے کہہ دی پیار کی بات
صحن زنداں کے بے وطن اشعار
سرنگوں، محو ہیں بنانے میں

(زنداں کی ایک شام)

بیزار فضا، درپئے آزار صبا
یوں ہے کہ ہر اک ہمدم دیرینہ خفا ہے
ہاں بادہ کشو آیا ہے اب رنگ پہ موسم
اب سیر کے قابل روشِ آب وہوا ہے
اُمڈی ہے ہر اک سمت سے الزام کی برسات
چھائی ہوئی ہر دانگ ملامت کی گھٹا ہے
وہ چیز بھری ہے کہ سلگتی ہے صراحی
ہر کاسۂ مے زہر ہلاہل سے سوا ہے
ہاں جام اٹھاؤ کہ بیادِ لب شیریں
یہ زہر تو یاروں نے کئی بار پیا ہے
اس جذبۂ دل کی نہ سزا ہے نہ جزا ہے
مقصودِ رہِ شوق وفا ہے نہ جفا ہے

(دستِ تہِ سنگ آمدہ)

نہ گُل کھلے ہیں، نہ اُن سے ملے، نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے
چمن میں غارت گلچیں پہ جانے کیا گزری
قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے

جیسا کہ پہلے ہی ذکر ہو چکا کہ فیض نے بھی ابتدا میں کچھ عشقیہ شاعری کی، لیکن بہت جلد وہ اس رنگ سے باہر آئے اور جب انھوں نے اپنے معاشرے، سماج اور ساتھ ہی ملک کی موجودہ سیاست پر غور کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ موجودہ وقت میں ایک نئے نظام اور نئے انقلاب کی بہت ضرورت ہے۔ فیض کا یقین اب پختہ ہو چکا تھا کہ مروجہ سیاسی و سماجی نظام نے کس طرح سماج میں مزدوروں و غریبوں کو دبائے رکھا ہے اور کس طرح ان مظلوم طبقوں کا استحصال روا رکھا جاتا ہے۔ وہ نوآبادکاری کے اس کھیل سے بھی واقف ہو چکے تھے جس کے ذریعے صدیوں تک انگریزوں نے ایشیائی لوگوں کو محکوم بنائے رکھا اور پھر ان کا استحصال کیا۔ فیض نے بارہا اس سامراجی و استحصالی نظام کو للکارا جس نے غریبوں اور مزدوروں کے خون سے اپنی نام نہاد 'تہذیب' تعمیر کی تھی۔ انھوں نے انگریزوں اور ان کے زرخرید غلاموں کا پردہ فاش کیا، لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ فیض نے بطور فیشن یا نعرے بازی کے ان مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع نہیں بنایا بلکہ اس سلسلے میں ان کا کمٹمنٹ واضح تھا اور اس فنی شعور کو بھی انھوں نے اپنی گرفت میں رکھا جس سے کوئی بھی شاعری اس شاعرانہ عظمت کو پہنچتی ہے جہاں وہ آفاقیت کو چھو لیتی ہے اور پوری دنیا کے عوام کی

آواز بن جاتی ہے۔ اس حوالہ سے پروفیسر ابوالکلام قاسمی کے یہ جملے ملاحظہ ہوں:

''اس ضمن میں بھی فیض کا امتیاز یہ ہے کہ دوسری موضوعاتی نظموں کے برخلاف انھوں نے ان نظموں میں وقتی اور اضطراری مسائل اور چیخ و پکار کی سطح تک پہنچ جانے والی بلند آہنگی سے احتراز کیا ہے۔ اس لیے کہ وہ وقتی طور پر فیشن بن جانے والے ترقی پسند موضوعات کے مقابلے میں آفاقی قدروں کے حامل سماجی مسائل اور موضوعات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔''[۳]

فیض کے اسی احتجاجی اور باغیانہ لہجہ کی گونج آج پہلے سے زیادہ سنائی دیتی ہے اور آج بھی دنیا کے مظلوموں کو حوصلہ عطا کرتی ہے کہ اب سامراجیت اور سرمایہ داری نظام نے استحصال کی نئی نئی صورتوں کو جنم دیا ہے۔ اس سلسلے میں فیض کی شاعری سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول، زباں اب تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول، کہ جاں اب تیری ہے
دیکھ، کہ آہن گر کی دکاں میں
تند ہیں شعلے، سُرخ ہے آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر کو زنجیر کا دامن
بول، یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں ک موت سے پہلے
بول، کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

(بول)

ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
ہاں تلخیٔ ایّام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہل ستم ، مشق ستم کرتے رہیں گے
منظور یہ تلخی، یہ ستم ہم کو گوارا
دم ہے تو مداوائے الم کرتے رہیں گے
اک طرز تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
اک عرضِ تمنا ہے سو وہ ہم کرتے رہیں گے

(لوح وقلم)

یونہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ ان کی رسم نئی ہے نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی

(نثار میں تیری گلیوں کے.....)

ایسی بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں جن سے فیض کا کلام بھرا پڑا ہے جہاں وہ مظلوموں کو زبان عطا کرتے نظر آتے ہیں اور ان کی طرف سے واضح طور پر کھڑے ہوتے ہیں، لیکن فیض کا کمال یہ ہے کہ وہ ہجوم کے ساتھ کھڑا ہو کر بھی نعرے بازی یا پروپیگنڈہ بازی پر نہیں اتر آتے بلکہ اُن کا کمال یہ ہے کہ اس ہجوم میں بھی وہ شاعرانہ اصولوں کی پاسداری کرتے نظر آتے ہیں جن سے ان کی شاعری میں ایک نئی طرح کی چاشنی اور حلاوت پیدا ہو جاتی ہے اور دل و دماغ پر بار نہیں گزرتی۔

شاعری کے بارے میں اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ وہبی ہوتی ہے جو بقول غالب:

'آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں' کے مصداق ہے۔ اس بات میں بڑی حد تک سچائی ہے، لیکن ہم اس بات کو بھی فراموش نہیں کر سکتے کہ ایک شاعر اپنے ماحول اور گرد و پیش یا سماج سے بھی متاثر ہوتا ہے جہاں سے وہ اپنے موضوعات اور مضامین اخذ کرتا ہے۔ دنیا کے بڑے شاعروں جن میں انیس، میر، غالب، اقبال، شیکسپیئر، ملٹن، ورڈس ورتھ وغیرہ شامل ہیں، نے اپنی شاعری کے موضوعات کے سلسلے میں اپنے اپنے سماجوں اور ماحول سے ہی استفادہ کیا اور پھر اپنی فنی استعداد اور صلاحیت سے اس میں آفاقیت کا رس گھول دیا۔ ایک بڑے شاعر کی عظمت اس بات میں پوشیدہ ہوتی ہے کہ جہاں وہ اپنے دور سے متاثر ہوتا ہے وہیں آگے چل کر وہ نہ صرف اپنے دور کو بلکہ آنے والے زمانے کو بھی متاثر کرتا ہے۔ فیض کے بارے میں بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے دور میں متحدہ ہندوستان کے سیاسی و سماج حالات کچھ ایسے ہی تھے جن سے ایک حساس طبیعت شاعر کا متاثر ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں اور بقول فیض غمِ جاناں اور غمِ دوراں تو ایک ہی تجربے کے دو پہلو ہیں۔ فیض جہاں اپنے دور سے متاثر ہوئے وہیں انھوں نے نہ صرف اپنے دور کو متاثر کیا بلکہ فیض کی مقبولیت اور ان کے کلام کی معنویت دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے کہ آج ظالم نے استحصال کے نئے نئے طریقے ایجاد کیے ہیں۔ سامراجیت اور

سرمایہ دارانہ نظام نے آج پہلے سے کہیں زیادہ اپنے پر پھیلائے ہیں اور ایشیائی اقوام ان استحصالی اور مکروہ نظاموں کے سب سے زیادہ شکار ہورہے ہیں۔ وہیں فیض آج سماج کے دوسرے پچھڑے اور مظلوم طبقات کی آواز بن کر ابھر رہے ہیں۔ فیض نے اپنی شاعری کے ذریعے ظلم و ناانصافی کے خلاف بارہا اپنی آواز بلند کی:

گڑی ہیں کتنی صلیبیں مرے دریچے میں
ہر ایک اپنے مسیحا کے خوں کا رنگ لیے
ہر ایک وصلِ خداوند کی امید لیے
کسی پہ کرتے ہیں ابرِ بہار کو قرباں
کسی پہ قتل مہ تابناک کرتے ہیں
کسی پہ ہوتی ہے سرمست شاخسار دو نیم
کسی پہ بادِ صبا کو ہلاک کرتے ہیں
ہر آئے دن یہ خداوند گانِ مہر وجمال
لہو میں غرق مرے غم کدے میں آتے ہیں

(دریچہ)

فیض کو ۱۹۶۹ء میں لینن انعام سے نوازا گیا۔ انعام کی تقریب میں انھوں نے اُردو میں تقریر کی اور اپنے نظریاتی موقف کو کھل کر سامنے رکھا۔ فیض نے اپنی تقریر میں کھل کر سامراجی نظام کی کوتاہیوں اور فریب کاریوں کا پردہ فاش کیا اور ساتھ ہی انسان کی آزادی، امنِ عالم اور انسانی بھائی چارے کی تلقین بھی کی:

''.....اور عقل اور سائنس اور صنعت کی کل ایجادیں اور صلاحیتیں تخریب کے بجائے تعمیری منصوبوں میں صرف ہوں، لیکن یہ جبھی ممکن ہے کہ انسانی معاشرے میں ان مقاصد سے مطابقت پیدا ہو اور انسانی معاشرے کے ڈھانچے کی بنائیں ہوس، استحصال اور اجارہ داری کے بجائے انصاف، برابری، آزادی اور اجتماعی خوشحالی میں اٹھائی جائیں.....سامراجی اور غیر سامراجی قوتوں کی لازمی کشمکش کے علاوہ، بدقسمتی سے بعض ایسے ممالک میں شدید اختلافات موجود ہیں، جنہیں حال ہی میں آزادی ملی، ایسے اختلافات ہمارے پاکستان اور ہمارے سب سے قریبی ہمسایہ ہندوستان میں موجود ہیں۔ بعض عرب ہمسایہ ممالک میں اور بعض افریقی حکومتوں میں موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان اختلافات سے وہی طاقتیں فائدہ اٹھا سکتی ہیں جو امن عالم اور انسانی برادری کی دوستی اور یگانگت کو پسند نہیں کرتیں۔ اس لیے صلح پسند اور امن دوست صفوں میں ان اختلافات کے منصفانہ حل پر غور وفکر اور اس کے حل میں امداد دینا لازم ہے۔'' [۴]

بیسویں صدی میں اقبال کے بعد فیض اردو کے سب سے بڑے شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں اور یہ بجا بھی ہے کہ فیض نے بڑی ہنرمندی سے اپنے وقت کے سیاسی و سماجی میلانات کو اپنی شاعری میں سمویا۔ فیض دوسرے شعرا کی طرح جذباتیت اور نعرے بازی کا شکار نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے ہمیشہ اس بات کا خیال رکھنے کی کوشش کی کہ فنی اصولوں کا خون نہ ہو۔ انھوں نے جہاں اس کی مثالیں اپنے کلام سے پیش کیں وہیں انھوں نے اپنے مضامین میں بھی اس پر زور دیا کہ فن کو پہلے فن ہونا چاہیے بعد میں کچھ اور۔ فیض، اقبال سے ان معنوں میں مختلف ہیں کہ انھوں نے آزادی کا خواب بھی دیکھا اور اس خواب کو پورا ہوتے ہوئے بھی دیکھا، لیکن یہ آزادی اس سے مختلف تھی جس کا خواب انھوں نے دیکھا۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں فیض کو اپنی زندگی میں دو دشمنوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک دشمن واضح تھا کہ سامراجیت اور نوآبادیات کا، دوسرے دشمن سے ان کا سامنا آزادی کے بعد پاکستان وہاں کے حکمرانوں کی صورت میں ہوا، لیکن اپنے خواب کو انھوں نے پہلے ہی اس وقت چکنا چور ہوتے دیکھا جب تقسیم کے وقت فرقہ وارانہ فساد برپا ہوئے جن میں لاکھوں لوگ مارے گئے۔ اس تناظر میں پروفیسر محمد زماں آزردہ کی رائے ملاحظہ ہو:

''اقبال کا دشمن واضح تھا، سامنے تھا۔ وہ اس سے مختلف سطحوں پر نبرد آزما ہوئے۔ اس کی حکومت کی مخالفت کی، اس تہذیب کو للکارا، اپنوں کو خبردار کرکے بیدار کرنے کی کوشش کی، مگر فیض کا المیہ دوہرا ثابت ہوا۔ اس نے آزادی دیکھی، تقسیم ملک کو دیکھا، فرقہ وارانہ فسادات دیکھے اور اپنوں کی زیادتیاں سہیں۔ آزادی کے آئیڈیل کی جن تصویروں کو اس نے اپنے ذہن کے ڈرائنگ روم میں سجا کے رکھا تھا وہ آئیڈیل ہی ریزہ ریزہ ہوگیا۔ اقبال نے آزادی کے تصور کے ایک رخ کے حصول کے لیے جدوجہد کی ترغیب دی تھی اور خود جدوجہد کی تھی، مگر فیض نے اس کا دوسرا رخ بھی دیکھا تھا۔ اقبال بدیشیوں سے عاجز تھا اور فیض نے اپنوں کی چنگیزیاں بھی دیکھیں۔'' [۵]

فیض نے متعدد نظموں میں پاکستان کے حکمرانوں کو للکارا اور ان کی چنگیزی کی نکتہ چینی کی۔ دراصل فیض پاکستانی حکمرانوں کی فریب کاریوں اور مکاریوں سے پوری طرح واقف ہوچکے تھے اور انھوں نے بارہا اپنی

شاعری میں ان مسائل کو موضوع بنایا۔اس طرح وہ پاکستانی حکمرانوں کا نشانہ بھی بنے اور انہیں جیل بھی جانا پڑا،لیکن ایک سچے انقلابی شاعر کی طرح فیض نے جیل میں اس ظلم کے خلاف اپنی آواز اٹھائی:

پھر حشر کے ساماں ہوئے ایوان ہوس میں
بیٹھے ہیں ذوی العدل گنہگار کھڑے ہیں
ہاں جرم وفا دیکھئے کس کس پہ ہو ثابت
وہ سارے خطا کار سرِ دار کھڑے ہیں

(قطعہ:دست صبا)

سنا ہے ہو بھی چکا ہے فراق ظلمت و نور
سنا ہے ہو بھی چکا ہے وصالِ منزل و گام
بدل چکا ہے بہت اہلِ درد کا دستور
نشاط وصل حلال و عذابِ ہجر حرام
جگر کی آگ نظر کی اُمنگ دل کی جلن
کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگار صبا کدھر کو گئی
ابھی چراغ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیِ شب میں کمی نہیں آئی
نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

(صبح آزادی)

دل سے پیہم خیال کہتا ہے
اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہوسکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو گیا
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

(زنداں کی ایک شام)

چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پر مجبور ہیں ہم
اور کچھ دیر ستم سہہ لیں، تڑپ لیں رو لیں
اپنے اجداد کی میراث ہے، معذور ہیں ہم

(چند روز اور مری جان)

فیض نے اپنی شاعری کے ذریعے مزدوروں،مظلوموں اور ناداروں کو آواز عطا کی۔انھوں نے سماج کے مظلوم طبقوں کے ساتھ روا رکھی جانے والی نا انصافی اور ظلم کے خلاف ہمیشہ اپنی آواز بلند کی۔فیض کا اختصاص ہے کہ انھوں نے ان مظلوم طبقوں کی مجبور زندگی کو موضوع بھی بنایا اور پھر ان مظلوموں کے ساتھ روا رکھے جانے والے مظالم کے خلاف بھی بولے۔چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

یہ گلیوں کے آوارہ بیکار کتے
کہ بخشا گیا جن کو ذوق گدائی
یہ ہر ایک کی ٹھوکریں کھانے والے یہ فاقوں سے اکتا کے مر جانے والے
یہ مظلوم مخلوق گر سر اٹھائے
تو انسان سب سرکشی بھول جائے
یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنالیں
یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبالیں

(کتّے)

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے اُبلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

(رقیب سے)

فیض نے فلسطین، بیروت اور دوسرے افریقی ممالک میں سامراجی طاقتوں کے مظالم کے خلاف آواز اٹھائی۔ان مظالم پر اُن کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔اُن کی شاعری محض ذاتی غم نہیں بلکہ اجتماعی احساس و واردات کا المیہ اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔یوں فیض کی شاعری میں عالمی مسائل جیسے موضوعات بھی پائے جاتے ہیں۔۱۹۷۲ء میں بیروت پر بمباری سے فیض تڑپ اٹھے اور ایک نظم ''عشق اپنے مجرموں کو پابہ جولاں لے چلا'' کہی۔

لوٹ کر آ کے دیکھا تو پھولوں کا رنگ
جو کبھی سرخ تھا، زرد ہی زرد ہے
اپنا پہلو ٹٹولا تو ایسا لگا
دل جہاں تھا وہاں درد ہی درد ہے
گلوں میں کبھی طوق کا واہمہ
کبھی پاؤں میں رقص زنجیر
اور پھر ایک دن عشق الٰہی کی طرح
رسن در گلو پابہ جولاں ہمیں

اسی قافلے میں کشاں لے چلو

اسی طرح فیض نے فلسطین کے مظلوم اور یتیم بچوں کے لیے لوریاں بھی لکھی ہیں۔ ''فلسطینی بچے کی لوری'' کا یہ بند ملاحظہ ہو:

مت رو بچے
رو رو کے ابھی
تیری امی کی آنکھ لگی ہے
مت رو بچے
کچھ ہی پہلے
تیرے ابا نے
اپنے غم سے رخصت لی ہے
مت رو بچے

فیض نے زنداں میں اور زنداں سے باہر، تنہائی اور انجمن میں، وطن میں اور وطن سے باہر ہر مقام پر شاعری کے ذریعے اپنے احتجاجی لہجے کو برقرار رکھا۔ انھوں نے اپنی شاعری کو صرف فارم یا ہیئت کا اسیر نہیں ہونے دیا بلکہ فیض کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ اُن کے یہاں باغیانہ لہجہ کے ساتھ ساتھ ایک طرح کا جمالیاتی شعور بھی ملتا ہے جس سے ان کی شاعری کو وہ تب و تاب عطا ہوتی ہے جو عوام و خواص دونوں کے دلوں کو گرماتی ہے اور قاری کو ایک نئی دنیا کی سیر کراتی ہے اور یہی فیض کا مخصوص شعری لہجہ اور شعری امتیاز ہے۔

حواشی

۱۔ شاعری کی قدریں، فیض احمد فیض، سویرا (لاہور) شمارہ ۱۲
۲۔ ترقی پسند جمالیات اور فیض کا شعری امتیاز، پروفیسر انور پاشا، آجکل (نئی دہلی) فروری ۲۰۱۱ء، شمارہ ۷
۳۔ نظم گوئی میں فیض احمد فیض کے امتیازات، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، (مشمولہ: شاعری کی تنقید، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ) ۲۰۰۱ء
۴۔ لینن انعام پر فیض کی تقریر، اردو محفل فورم (آن لائن اُردو لائبریری)، ستمبر ۲۰۱۵
۵۔ بیسویں صدی کے دو اہم شاعر، اقبال اور فیض..... کچھ مماثلتیں، پروفیسر محمد زماں آزردہ، بازیافت (شعبہ اردو، کشمیر یونیورسٹی سرینگر) ۲۰۱۳ء، شمارہ ۵۲-۵۳

○○

○○

دہلی کے ممتاز صحافی

اس کتاب کی اشاعت کا اصل مقصد یہ ہے کہ ہمارے وہ باکمال صحافی جنھوں نے اپنی فکر و دانش سے ملک کے نظام کی سمت و رفتار متعین کی اور ایسے زمانے میں اس فن سے وابستہ رہے جب کہ یہ صرف گھاٹے کا سودا تھا لیکن ان سرکردہ صحافیوں نے اپنے اصولوں سے کبھی بے وفائی نہیں کی۔

ان اکابرین کی سوانح اور کارناموں کو منظرِ عام پر لانے کے لیے یہ کتاب ایک دستاویز کا درجہ رکھتی ہے۔ اکادمی کی کوشش ہے کہ ان لوگوں کے حالاتِ زندگی سے ہماری نوجوان نسل واقف ہو سکے نیز ان کے اصول و ضوابط، ان کی میانہ روی سے سبق حاصل کر سکے۔

مصنف: سہیل انجم صفحات: ۲۳۶، قیمت: ۱۵۰ روپے

اردو صحافت کا ارتقا

اردو صحافت نے ارتقاء کا عمل کن مراحل سے گزر کر پورا کیا ہے اور اس کے صحافیوں نے اپنی جفاکشی، محنت اور جدوجہد سے تاریخ کے صفحات پر جو نقوش ثبت کیے ہیں یہ کتاب دراصل اسی کا ایک مبسوط خاکہ ہے جس میں دو صدیوں پر محیط اردو صحافت کے تاریخی، فنّی اور تکنیکی ارتقاء کی تاریخ کو سمیٹا گیا ہے۔ کتاب میں اردو صحافت کو درپیش مسائل پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔

مصنف: معصوم مرادآبادی صفحات: ۲۲۴، قیمت: ۱۵۰/روپے

ناشر: اردو اکادمی، دہلی